کنڑ کہانی

روندی گئیں کلیاں

ترجمہ: ادیب اختر

بنور، میسور، کرناٹکا، موبائل: 9845371383

لگ بھگ دو ماہ بعد اسکول پھر سے شروع ہوا تھا، اسکول جانے کی مجھے پہلے جیسی خوشی ہرگز نہیں ہو رہی تھی، دل اکتا گیا تھا، پھر بھی بھاری من سے ممی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں قدم رکھا تو اچانک ہی آنکھیں بھر آئیں۔ دو چار قدم آگے بڑھنے کے بعد میں نے مڑ کر ممی کی طرف دیکھا وہ بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ چلتے چلتے رُک گیا تو ممی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہا۔ وہ سمجھ گئیں کہ میں ہمت ہار چکا ہوں۔

دو مہینے پہلے، دوپہر کے وقت میں نے زندگی کی پروا کیے بنا کلاس سے باہر نکل کر اسکول کے پچھلی گیٹ کی طرف پوری تیزی سے دوڑا تھا، پھر گیٹ سے باہر نکل کر اُسی رفتار سے گھر کا راستہ پکڑا تھا۔ اس وقت مجھے اس بات کا پورا بھروسہ نہیں تھا کہ میں صحیح سلامت گھر پہنچوں گا۔ یہ سب باتیں مجھے پورے طور پر یاد نہیں ہیں کچھ کچھ یاد ہیں اُس وقت میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر بے دردی سے پاؤں رکھ رہا ہوں۔ میرا یونیفارم، اور جوتے جگری دوستوں کے خون سے لت پت ہو گئے تھے، مگر افسوس کہ میں نے اُدھر دھیان نہیں دیا تھا۔ یونیفارم سے تو گرم گرم خون ٹپک رہا تھا۔ کلاس سے نکلتے وقت ساتھیوں کی لاشوں کو پھاندتے ہوئے دو چار بار گرتے گرتے بچا تھا۔

پوری کلاس خون سے لت پت تھی، وہ ساتھی جنھیں گولی لگی تھی، وہ تو ٹھنڈے ہو گئے تھے اور وہ جو زخمی ہوئے تھے وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔ زخمیوں میں سے کوئی پانی پانی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ یہ آواز مجھ تک پہنچی تو میں نے ایک کونے میں پانی سے بھری بوتل لا کر اُسے تھما دی۔ بوتل اُسے تھماتے ہوئے اُس کا ڈھکن کھول کر دیا تھا کہ نہیں مجھے پتہ نہیں۔

صبح اسکول کے جس میدان میں راشٹریہ گیت گونجا تھا، اب اُسی میدان میں آتنک وادیوں کی بندوقوں سے نکلی گولیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

اسکول کے پچھلی گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد کہیں بھی رُکے بنا میں گھر کی طرف دوڑنے لگا تھا، اسکول میں گونجی ہوئی گولیوں کی آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھی۔

اِن سب گھٹناؤں کو بیتے کم سے کم ساٹھ دن ہو گئے ہیں، مگر میرے من میں اب بھی گولیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔

میرا نام الماس ہے، آٹھویں جماعت کا طالب علم ہوں، شہر کی ایک سرحد پر ہمارا اسکول ہے، ہماری کلاس میں پورے پینتالیس طلبا ہیں۔ ہم سبھی کلاس میٹ آپس میں مل جل کر بھائیوں کی طرح رہتے تھے یوں جیسے ہم سبھی ایک ہی ماں کے بچے ہوں اور ہمارے جسموں میں ایک ہی ماں کا خون بہہ رہا ہوں۔

جب آتنک وادیوں نے آکر ہماری کلاس میں گولیاں چلائی تھیں تو کچھ کی جان چلی گئی، کچھ زخمی ہو گئے، مگر ان سب کے جسموں سے نکلا خون ایک ساتھ ساری کلاس میں بہہ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ واقعی ہم سب ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔

میرے بازو کو چھوتے ہوئے گولی نکلی تھی، وہاں سے خون بہہ رہا تھا، دھڑکتے دل کے ساتھ کلاس سے نکلتے وقت میں نے اُدھر دھیان نہیں دیا تھا، گھر پہنچنے کے بعد ہی ممی نے مجھے اس کی جانکاری دی تھی۔

اکثر میں سوچتا ہوں کہ ہم سبھی کلاس میٹ ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا۔

تین مہینے پہلے حسین کے والد کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو گیا۔ جب حسین دوسرے شہر جانے کی تیاری کرنے لگا تو اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے احساس نے ہمیں بہت رُلایا تھا۔ اُس وقت صرف ایک ساتھی کو ہم اپنے سے جدا کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے، مگر اب ہم نے صرف ایک ہی دن میں بیس ساتھیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیے تھے۔ ہمارے بیس ساتھیوں کو آتنک وادیوں نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا۔

پورے اسکول میں مارے جانے والے طلبا کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔

شاہین مس، گیٹ کیپر رسول، ٹمپو ڈرائیور نعمان، اب نہیں رہے، میرے انتہائی قریبی ساتھیوں میں یوسف، یونس، محمد، ریحان بھی نہیں رہے، اُن سب کو میں نے کھو دیا، بس اُن کو یاد کر سکتا ہوں۔ میں آتنک وادیوں کے لیے ہمیشہ بد دعا کرتا ہوں۔ خدا اُن کو بری سے بری موت دے۔ اُن کے مرتے وقت اُن کو کلمہ نصیب نہ فرمائے۔

ریحان کی کے میتھ کے نوٹس، یوسف کے کلر پنسل بکس، محمد نے جو کہانیوں کی کتاب مجھے پڑھنے کو دی تھی، وہ میرے پاس رہ گئی۔ ساتھیوں کی اُن چیزوں کو واپس کرنا اب ناممکن ہے۔

عمران کو میرا جیومیٹری بکس بے حد پسند تھا، کئی بار اُس نے مجھ سے مانگا تھا، مگر میں نے نہیں دیا تھا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو عمران، اب آؤ میں تمھیں جیومیٹری بکس بے جھجک دینے کو تیار ہوں۔ آ بھی جاؤ یار! فیض میں تم کو لنگڑا گھوڑا کہہ کر چڑاتا تھا، پلیز اس بات کو بھول جاؤ۔

اُس دن اسکول سے لوٹنے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا، ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا تھا، ممی پاپا میرے قریب کھڑے تھے اور مجھے تسلّی دے رہے تھے۔

میں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ میرے کون کون ساتھی بچ گئے ہیں۔

دو ماہ پہلے آتنک وادیوں نے جس وقت ہمارے اسکول پر دھاوا بولا تھا، اُس سے کچھ ہی وقت پہلے شاہین مس ہمیں سمجھا رہی تھیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے عرب دیش میں وہاں کے لوگ اپنے گھروں میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، یہ سب کچھ جہالت کی بنیاد پر کرتے تھے وہ (مگر اب آتنک وادی اسلام کی حفاظت کے نام پر معصوم بچوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ مسجدوں گھس کر نمازیوں پر بھی گولیاں چلا رہے ہیں۔ لعنت ہے آتنک وادیوں پر) جب شاہین میں ہمیں یہ سب کچھ سمجھا رہی تھیں تو باہر کچھ دوری پر گولیوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مس سبق جہاں تہاں چھوڑ کر باہر چلی گئیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ گولیاں کون چلا رہا ہے۔ ہم نے بھی کھڑکیوں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کالے کپڑے پہنے، منہ پر نقاب ڈالے چار چھ نوجوان بندوقیں تھامے، کلاس روم کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

میں نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ''بچوں! آتنک وادی ہمارے اسکول میں گھس آئے ہیں، اب تو ہمیں اللہ ہی بچائے گا۔''

ہم سب پریشان ہو اُٹھے، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہم کہاں پناہ لیں، کہاں چھپ جائیں، کلاس روم سے باہر جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں منہ پر کپڑے لپیٹے ہوئے ایک آتنک وادی تیز قدموں سے ہماری کلاس میں داخل ہوا، اُس کی خوفناک آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ سب سے پہلے اُس نے شاہین مس پر گولی چلا دی، پھر اس نے بندوق لڑکوں کی طرف گھما دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے پیڑ سے کٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح لڑکے گر پڑنے لگے۔

اس وقت تو مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ مجھے گولی کہاں لگی ہے، مگر پھر بھی میں گر پڑا، مجھے زیادہ درد کا احساس تو نہیں ہو رہا تھا، اس کے باوجود بھی میں خوف کے مارے ایک کونے میں مردے کی طرح پڑا رہا۔

ساتھ والی کلاس میں طلبا بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے، طلبا کلمہ پڑھ رہے تھے، آتنک وادی اُن پر گولیاں برسا رہا تھا۔ کلمہ کی آواز گولیوں کی آواز میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کونے میں لیٹے ہی لیٹے کنکھیوں سے آتنک وادی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔

زندگی میں اگر اُس نے کبھی مقدس کتاب قرآن مجید پڑھی ہوتی، پڑھنے کی بات تو دور، اگر کبھی صرف اُس مقدس کتاب کو دیکھا ہوتا تو یقیناً اُس کی آنکھوں سے آگ نہ برس رہی ہوتی۔ مقدس قرآن تو رحم دلی کا سبق دیتا ہے۔

دھرم کے نام پر اللہ اِس زمین پر تشدد پھیلانے کا کسی کو اجازت نہیں دیتا، مگر یہ آتنک وادی راکشش ہر وہ کام کرتے ہیں، جن سے روکا گیا ہے۔

وہ راکشس ہماری کلاس سے باہر چلا گیا تھا میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، وہاں کا منظر دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ میرے جسم کو ساتھیوں کا تازہ تازہ خون چھونے لگا تھا۔ میں بے چین ہو اُٹھا۔

بلند آواز میں کلمہ پڑھتے ہوئے لڑکوں پر گولیاں برسانے پر واقعی اللہ کو دُکھ ہوا ہوگا، کاش میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اللہ کو پیارا ہو گیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں نہ جانے میں کتنی دیر تک وہاں پڑا رہا، پتہ نہیں، گولیوں کے چلنے کی آوازیں رُکی تو نہیں تھیں، مگر اُن میں کچھ کمی آئی تو میں گرتے پڑتے، اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کھڑکی کے پاس چلا آیا، اسکول کے میدان میں فوجی جوانوں کو دیکھ کر کچھ ہمت ہوئی۔

کچھ دنوں کے علاج کے بعد جہاں گولی چھو کر گئی تھی، وہ زخم تو بھر گیا، مگر ساتھیوں کو کھو دینے کا وہ زخم نہیں بھرا جو دل کو لگا تھا۔ اسپتال سے

ڈسچارج ہونے کے بعد میں نے پرانے اخبارات اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔

خون سے بھرے کلاس رومس، دیواروں پر خون کے داغ اور گولیوں کے نشانات، بکھری پڑی چیزیں، جلی ہوئی کتابیں، ہر جگہ خون ہی خون۔ مختصر یہ کہ آتنک وادیوں نے ہمارے اسکول کو قبرستان بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

سائنس مس عقیلہ کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا، وہ تو ہر دن اسکول آنے سے پہلے قرآن مجید پڑھ کر آتی تھیں۔

نویں کلاس کے لڑکوں کو زندگی کا لالچ دے کر مارا گیا تھا، اُس کلاس میں داخل ہوئے لمبی داڑھی والے آتنک وادی نے لڑکوں سے پوچھا تھا کہ کن کن کو زندہ رہنے کی تمنا ہے، وہ ہاتھ اُٹھائیں۔ سبھی لڑکوں نے ہاتھ اُٹھایا تھا، مگر آتنک وادی نے آٹھ لڑکوں کو بلیک بورڈ کے پاس لے جا کر کھڑا کر کے اُن پر گولیاں چلا دی تھیں۔ اس کے بعد اُس نے پھر لڑکوں سے پوچھا تھا کہ کن کن کو زندہ رہنا ہے۔ اب کی بار کسی بھی لڑکے نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تو وہ آگے بڑھ کر ایک ایک کو کھینچتے ہوئے بلیک بورڈ کے پاس لے گیا تھا۔ ان سب باتوں کی جانکاری میں نے پرانے اخبارات سے لی تھی۔

دو مہینوں کے درمیان سب سے دور رہ کر میں نے سنجیدگی سے کئی ساری باتوں کے بارے میں سوچا ہے۔ ہمارے اسکول کے آگے جو میدان ہے اس میں گل مہر کے اونچے اونچے پیڑ ہیں۔ ہم سبھی لڑکے اُن کے نیچے کھیلتے تھے۔ اپریل، مئی کے مہینوں میں گل مہر کی ٹہنیاں لال پھولوں سے لد جاتی تھیں۔ پیڑوں کے اطراف بکھرے ہوئے پھولوں کو روندنے کو ہمارا جی نہیں چاہتا تھا، ہمیں دُکھ کا احساس ہوتا تھا، اِن پھولوں کو تو ہم چھوٹے چھوٹے دل سمجھتے تھے۔ پھولوں کے ساتھ رہ کر ہم بھی پھول ہو گئے تھے، مگر آتنک وادیوں نے آ کر پھولوں کو روند دیا۔

آتنک وادیوں کا بھی کوئی گھر بار ضرور ہوتا ہوگا، اُن کے بھی بیوی بچے ہوں گے۔ جب وہ گھر جاتے ہوں گے تو چاہے اُن کا دل کتنا ہی برا سہی، وہ اپنے بچوں کو ضرور پیار کرتے ہوں گے۔ وہ اپنے بچوں کو کب پیار کرتے ہوں گے۔ دوسروں کے بچوں پر گولی چلانے سے پہلے یا پھر گولی چلا کر آنے کے بعد؟

آتنک وادیوں کی مائیں اپنے لڑکوں کی کرتوت دیکھ کر اُن کو جنم دینے پر اپنے آپ کو کوستی ہوں گی؟

آتنک وادی اللہ کے آگے کبھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے وقت اپنے ہاتھوں کو لگے خون کے داغوں پر ضرور دھیان دیتے ہوں گے؟

یونس کا گھر ہمارے گھر سے بہت قریب ہے، اتوار کے دن میں ضرور اس کے گھر جاتا تھا، وہ گھر پر میرا انتظار کرتا تھا۔ اب یونس نہیں رہا، میرا دل اُس کے گھر جانے کو تیار نہیں۔ اُس کی چیزوں کو لاوارث دیکھ کر میں مایوس ہو جاؤں گا، جب کوئی انسان یتیم ہو جاتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح ضرور زندہ رہ سکتا ہے، مگر جب چیزیں لاوارث ہو جاتی ہیں تو وہ بیکار ہو جاتی ہیں۔

یونس کو ہوائی جہاز پائلٹ بننے کی خواہش تھی۔ محمد کو انگلش میں کہانیاں لکھنے کی خواہش تھی۔ جب کبھی ہمارے اسکول کے اوپر سے آسماں پر ہوائی جہاز اُڑتا تو، یونس اُسے اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

مگر آتنک وادیوں نے خوابوں کو قتل کر دیا۔

میں خود ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، مگر میں نے اپنے خواب کو خود قتل کر دیا، یہ اس لیے کہ کل اگر میں سچ مچ ڈاکٹر ہو جاؤں تو، آتنک وادیوں نے کسی اسکول پر حملہ کر دیا تو وہاں کے معصوم بچوں کا پوسٹ مارٹم کرنے کی مجھے نوبت نہ آئے۔

ممی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں داخل ہوا تو گھنٹی بج چکی تھی، قومی گیت کے بعد تمام لڑکے اپنی اپنی کلاس میں جا چکے تھے، میدان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، جو جان لیوا تھی۔

ممی کے ساتھ کچھ آگے بڑھا تو اچانک میری نظر اُس لڑکے پر پڑی، جو میری ہی طرح اپنی ممی کے ساتھ آیا تھا، وہ سر جھکائے مسلسل روئے جا رہا تھا۔

میں اُس روتے ہوئے لڑکے کی طرف بڑھا، یہ تو آٹھویں، بی سیکشن کا جاوید تھا۔ اُس کی کلاس کے سبھی لڑکے مارے گئے تھے، جس دن آتنک وادی نے ہمارے اسکول پر دھاوا بولا تھا، اتفاق سے اُس دن جاوید اسکول نہیں آیا تھا۔

''اُس دن میں بھی اسکول آیا ہوتا تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ میں بھی مر جاتا۔'' اِتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔

اُس کی باتیں سن کر میں بھی رونے لگا۔ دیر تک ہم روتے رہے، ہمارے ساتھ ہماری مائیں بھی روتی رہیں۔

''میں اکیلا ہو گیا ہوں میرا کوئی دوست نہیں جاوید نے کہا۔

''میں تمہارا دوست بنوں گا اتنا کہہ کر میں اس سے لپٹ گیا۔

یوسف، یونس، محمد، ریحان اور نہ جانے کون کون یاد آنے لگے۔

◆◆◆